لسانی تغیّرات

ڈاکٹر مقبول نثار ملک☆

Linguistic Changes

Dr. Maqbool Nisar Malik

Abstract:

Variation and deviation in all the languages of the globe is a perpetual phenomenon. This phenomenon is inevitable for the perpetuity and enrichment of the languages. Every epoch has its indispensable needs and demands. If a language fails to meet these needs and demands, it will lose its ground for not contending the progressive languages of the civilized world. Many a language of the world has vanished as a result of ignoring this phenomenon of variation. Vital languages keep on modernizing their vocabulary and style and abandoning the obsolete vocabulary. No doubt, modern literary terms and progressive styles of the writers go a long way in developing and improving the languages but the fact remains that living languages are the outcome of the language spoken by the general masses in a particular area.

In the evolutionary process of Urdu the regular and irregular use of foreign words has been a common feature. This process of urduisation demanded the regularization of the process, in the beginning of the 18th century, revolutionary changes were brought about in Urdu discarding. A glaring example of this reformation is that of a renowned Urdu poet of the 18th century named "Hatim" who transformed his work within a short period of 26 years because the language, after passing though many changes, had entered the next phase.

All over the world, process of variation in languages is the order of the day and Urdu is no exception. The present study presents an analysis on the process of variation in languages.

Key words:

Language, Linguistics, Reformation, veriation, Masses

☆ صدرِ شعبہ اُردو، یونیورسٹی آف لاہور، سرگودھا کیمپس سرگودھا

کلیدی الفاظ:

زبان، لسانیات، تغیرات، تہذیب، ارتقاء

زبانیں اپنے ارتقائی مراحل طے کرتے ہوئے مختلف خطّوں اور متنوع تہذیبی مراکز کی زبانوں پر اپنے اثرات مرتب کرتی ہیں اور ان سے اثرات لیتی ہیں۔ زیادہ تر یہ اثرات لغات لفظیات اسماء ضمائر، تراکیب، ضرب الامثال، تشبیہات، تلمیحات اور رسم الخط کے حوالے سے سامنے آتے ہیں۔ جب کہ صرف و نحو اور بنیادی ڈھانچے کے سلسلے میں وہ بالعموم اپنا تشخص بر قرار رکھتی ہیں لیکن زبانوں کی تاریخ اور ادوار پر تحقیق کی جائے تو تغیر و تبدل کا سلسلہ بعض زبانوں کے صرف و نحو پر بھی کار فرما دکھائی دیتا ہے۔ دراصل انسانوں، حیوانوں اور پرندوں کی طرح زبانوں کو بھی مسافرت کا سامنا رہا ہے۔ عین ممکن ہے کہ کسی زبان کا ابتدائی ھیولیٰ کسی دُور دراز خّطے میں تیار ہوا ہو، اُس نے ارتقا کے اوّلین مراحل کسی دوسرے خطے میں طے کیے ہوں، اپنی شناخت کسی بفر زون میں بنائی ہو جب کہ تکمیلی مراحل کسی خاص خطہِ ارض یا شہر میں حاصل کیے ہوں۔ یہ تکمیلی مراحل اُس صورت میں سامنے آتے ہیں۔ جب کسی خاص خطے یا شہر کے باسی اس زبان کو اپنی بول چال کا ذریعہ بنالیں۔ رفتہ رفتہ وہ زبان اس خطے کی تہذیب، ماحول، آب و ہوا، بولنے والوں کے اعتقادات، عادات، تاریخی ورثے اور معاشی کار گزاریوں کو اپنے اندر اس طرح سمیٹ لیتی ہے کہ ایک خاص لہجہ، محاورہ اور روز مرہ وجود میں آتا ہے۔ اور وہ زبان ترقی کرتے ہوئے تخلیق ادب کے اگلے مرحلے میں داخل ہو جاتی ہے۔ یہ مرحلہ نہ صرف اس شہر کو لسانی پہچان عطا کرتا ہے بلکہ اسے بتدریج مرکز زبان کے درجے پر فائز کر دیتا ہے۔

زبانیں اپنی خصوصی شناخت بنانے اور ادب کی تخلیق کے بعد بھی تغیرات کے ادوار سے گزرتی رہتی ہیں۔ تغیرات کی یہ صورتیں کئی طرح کی ہوتی ہیں۔ ان میں صوتی تبدیلیاں وہ ہیں جو آواز کے زیر و بم سے تعلق رکھتی ہیں۔ یہ ایسی لسانی اصوات ہیں جو ایک خاص مرحلے پر متاثرہ زبان کی مروجہ اصوات کے مطابق تبدیل ہو جاتی ہیں۔ بعض اوقات کوئی آواز حذف ہو جاتی ہے۔ بعض صورتوں میں کلمے کی کسی آواز کی تبدیلی نواحی علاقوں کی آوازوں کے نتیجے میں بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ جب کہ آس پاس کی آوازوں سے لاتعلق رہ کر بھی یہ عمل صورت پذیر ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ اس طرح بعض تبدیلیوں میں یہ عمل مرحلہ دار ہوتا ہے اور بعض میں براہِ راست۔

تغیر و تبدل کا ایک رجحان جو کم و بیش ہر لسانی گروہ میں نظر آتا ہے، وہ کلموں کو مختصر اور سادہ بنانا ہے۔ دنیا کی اہم زبانوں کی تواریخ پر نظر ڈالی جائے تو ان میں پُرانے طویل، بھاری بھر کم اور بوجھل کلمے رفتہ رفتہ مختصر ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔ بعض صورتوں میں زبان میں لب و لہجہ کی تبدیلی سے دُوہرے مصّوتے اکہرے رہ جاتے ہیں جبکہ بعض اوقات اکہرے مصوتے دوہرے مصوتوں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ اس طرح مصمتوں اور مصوتوں کا باہم ادغام بھی ہو جاتا ہے۔ اور یہ بھی مشاہدے میں آیا ہے کہ ایک ہی کلمے میں ایک سے زیادہ آوازیں بھی تبدیل ہو جاتی ہیں۔ زیادہ تر یہ عمل اُس صورت میں دیکھنے میں آتا ہے جب مختلف زبانیں بولنے والے ہنگامی طور پر یا معمول کے تحت باہم لسانی لین دین کرتے ہیں۔ اس طرح علمی و ادبی تبادلے، تدریس و تعلیم اور اجتماعی نوعیت کے مباحث سے مختلف زبانوں میں دخیل الفاظ اور نئے نئے اسالیب کا اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ جس سے زبان تغیرات کے مختلف مدارج سے گزرتے ہوئے نئے معیارات میں داخل ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں خلیل صدیقی کا نقطہ نظر ہے۔

> ''عام طور پر اسمائے مانعہ ہی کو دخیل الفاظ کے طور پر لیا جاتا ہے ضمائر اسمائے اشارہ اور اعداد وغیرہ شاذونادر ہی دوسری زبانوں سے لیے جاتے ہیں، دخیل الفاظ کی تعریف اپنی زبان کے قاعدوں کی رو سے ہوتی ہے۔ اُردو میں بہت سے دخیل الفاظ اُردو قواعد کے تحت استعمال ہوتے ہیں لیکن اسمِ فاعل، اسمِ مفعول، اسمِ ظرف، اسمِ آلہ، حرفِ شرط، حرفِ تمنا، واوٴعاطفہ، نفی تاکید، استسنا وغیرہ ہی فارسی سے نہیں لیے گیے بلکہ جمع بنانے کے قاعدے بھی اکثر موقعوں پر فارسی سے لیے گئے ہیں۔ کبھی کبھی زبان کی نحو بھی دوسری زبان کی نحو سے متاثر ہو جاتی ہے۔ سنیتی کمار چیٹر جی کی یہ رائے ہے کہ وسط ہند آریائی کے آغاز سے ہی اس پر دراوڑی نحو کے اثرات پڑنے لگے تھے یہاں تک کہ جدید ہند آریائی زبانوں کی نحو دارا وڑی نحو جیسی ہو گئی۔''[۱]

خلیل صدیقی اُن ماہرین زبان میں شامل ہیں جو اس بات کو تسلیم نہیں کرتے کہ زبانیں لسانی تغیرات کے دوران اپنے صرف و نحو کے ڈھانچے کو برقرار رکھتی ہیں لیکن اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ دوسری لسانی تبدیلیوں کے برعکس صرفی و نحوی تبدیلیاں نسبتاً کم دیکھنے میں آتی ہیں۔ جہاں تک زبان میں ہونے والی معنوی تبدیلیوں کا تعلق ہے۔ اس سلسلے میں دو امور کو پیش نظر رکھنا ضروری

ہے۔ یعنی اگر کسی زبان کا لفظ دوسری زبان میں من و عن داخل ہو گیا ہے تو وہ اکثر صورتوں میں اپنے معنی اور مفہوم کو برقرار رکھتا ہے۔ اگر وہ محاورے میں شامل ہو گیا ہے تو اس کا مفہوم تبدیل ہو جاتا ہے۔ اگر وہ اپنی اصل حالت برقرار نہیں رکھ سکا تو بھی اس کے معانی تبدیل ہو سکتے ہیں۔ محدود صورتوں میں ایسے دخیل الفاظ بھی مشاہدے میں آتے ہیں کہ وہ ایک مدت کے بعد اپنے اُس مفہوم سے دور ہو جاتے ہیں جو کہ وہ اپنی اصل زبان میں اختیار کیے ہوئے تھے۔ اس ضمن میں متعلقہ زبان کے قواعد بھی اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ لفظوں کی معنویاتی تبدیلیوں کو سمجھنے کے لیے رائج کلموں کے متروک ہونے اور نئے کلموں کے وجود میں آنے کے عمل کو سمجھنا ضروری ہے۔ لفظوں کا باہم تبادلہ ہو یا اُن میں معنوی تغیرات کا عمل، یہ زبان کی تاریخ کے ہر دور میں دکھائی دیتا ہے۔ کبھی یہ عمل سُست ہوتا ہے کبھی تیز، اس کا انحصار متعلقہ خطے کے سیاسی، سماجی اور معاشی حالات پر ہوتا ہے۔ بیرونی حملے، نقل مکانی اور تجارتی اور نو آبادیاتی عوامل بھی اس سلسلے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

تاریخی اور تقابلی لسانیات کا مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے۔ کہ دنیا کی بیشتر زبانوں کو مخلوط زبانوں کے زمُروں میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ ان زبانوں میں اطراف و جوانب کے ساتھ ساتھ بیرونی زبانوں کے لغات کے شامل ہونے سے ایک ہی مدلول کے لیے کئی کئی کلمے رائج ہو جاتے ہیں، جن میں آہستہ آہستہ لطیف و نازک امتیازات پیدا کر لیے جاتے ہیں۔ بعض اوقات ایسے کلموں کے افہام و تفہیم میں مشکل بھی پیدا ہو جاتی ہے لیکن کلموں کے مفاہیم کو سیاق و سباق کے حوالے سے سمجھ لینے سے غلط فہمیوں کے امکانات کو کم کیا جا سکتا ہے۔ بہت سے دخیل کلموں کو معنوی تصرف کے بعد اپنایا جاتا ہے۔ بعض اوقات استفادہ کرنے والی زبان میں ان کو بالکل نئے معنوں کے ساتھ اپنا لیا جاتا ہے۔ دخیل کلموں کے رائج ہونے اور بعض کلموں کے متروک ہونے سے زبان جن تغیرات سے گزرتی ہے، اس سے نئے دور کے قاری کو پُرانی زبان کے سمجھنے میں خاصی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ لسانی تغیرات کے اس عمل سے رائج کلموں میں جو صوتی و معنوی تبدیلیاں ہوتی ہیں، ان سے زبان عصری تقاضوں سے عہدہ برآ ہوتی ہے، اپنے آگے بڑھنے کا راستہ ہموار کرتی ہے۔ اپنے اندر وسعت پیدا کرتی ہے اور بدلتے ہوئے تعلیمی، سماجی اور ادبی تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے اپنا کردار ادا کرتی ہے۔ اس سلسلے میں خلیل صدیقی کا نقطہ نظر قابل ذکر ہے۔

> ''زبان کے فطری ارتقاء کا دارومدار ان کلموں اور اسالیب پر ہوتا ہے جو لسانی گروہ کے افراد یا بولنے والوں کی وساطت سے ظہور میں آتے رہتے ہیں، اور قبول عام حاصل کر کے زبان کا حصہ بنتے رہتے ہیں۔ اِرادی تشکیل بھی زبان کے ارتقاء میں مدومعاون ہوتی ہے۔ علما کی وضع کردہ اصطلاحیں اور ادیبوں کی ادبی ولسانی اختراعات سرمایہ زبان میں قیمتی اضافہ ضرور کرتی ہین لیکن بول چال کی زندہ اور فطری زبان عوام، اہل حرفت اور محنت کشوں ہی کی مرہون منت ہوتی ہے۔ لسانی گروہ کے افراد، دانش وریا کم پڑھے لکھے، قیاس وتمثیل سے زبان کے سرمائے میں اضافہ کرتے رہتے ہین۔ اس اضافے میں کلموں کی حیثیت نمایاں ہوتی ہے۔''(۲)

لسانی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ زبان پر اکتساب کے اصولوں کا نسبتاً زیادہ اطلاق ہوتا ہے۔ اس میں تصرفات کے ساتھ ساتھ اصلاح، دخول اور متروکات کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ یہ عمل کم وبیش دنیا کی ہر زبان میں دیکھا جا سکتا ہے۔ آج دنیا کے مختلف ممالک میں مختلف زبانیں جو خدوخال اور تشخصات لیے ہوئے ہیں، صدیوں پہلے ان کا رنگ روپ اس سے بہت مختلف تھا۔ عین ممکن ہے کہ آج جس زبان کو ہم اپنی مادری زبان کی حیثیت سے سیکھے بغیر بلا تامل اور فل البدیہ بولتے اور سمجھتے ہیں۔ماضی میں اس کا روپ ہمارے لیے غیر مانوس اور اجنبی ہو اور اس کی وجہ یہ ہے کہ مختلف ادوار میں تغیرات کا عمل اس کے حال کو اس کے ماضی سے مختلف بتا دیتا ہے۔ ایک زندہ زبان کا وصف یہ ہے کہ وہ خود کو وقت کے تقاضوں کے اور بدلتے ہوئے معیارات میں ڈھال کر اپنے لیے آگے بڑھنے کا راستہ ہموار کر لے۔ جو زبان اس صلاحیت سے عاری ہو، وہ زیادہ دیر تک اپنا وجود برقرار نہیں رکھ سکتی۔ آج دنیا کی ہزاروں زبانوں کے صفحہ ہستی سے نابود ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ بدلتے ہوئے تقاضوں سے خود کو ہم آہنگ نہ کر سکیں۔ اپنے اندر اصلاحات لا سکیں نہ دوسری ترقی یافتہ زبانوں سے فیض یاب ہو سکیں۔ جن زبانوں نے خود کو بدلتے ہوئے تقاضوں کے تحت ڈھال لیا وہ نہ صرف زندہ رہیں بلکہ ترقی کے مراحل طے کرتے ہوئے اعلیٰ ادب کی تخلیق کا باعث بھی بنیں لیکن جو زبانیں ایسا نہ کر سکیں۔ ان کا فطری ارتقاء رک گیا اور وہ کتابوں یا صحیفوں ہی میں مقید ہو کر رہ گئیں۔ حقیقت میں زندہ زبان کا تعلق خواندگی کی شرح سے نہیں بلکہ ابلاغ، تغیر اور فطری ارتقاء کے عمل سے ہے۔ بول چال، سننا اور یاد رکھنا کسی بھی زبان کے لیے غذا کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر اسے یہ غذا میسر نہ آئے تو اس کی نشوونما رُک جاتی ہے اور آخر کار

وہ ماضی کے دھندلکوں میں روپوش ہو کر رہ جاتی ہے۔ زندہ زبانوں کو مردہ بنانے کے عوامل میں ان پر تقدس یا خواص کا رنگ چڑھانا بھی شامل ہے۔ اس عمل سے انھیں بولنا، سیکھنا اور اس میں تصنیف و تالیف کا کام ایک خاص مذہبی یا سماجی طبقے تک محدود ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ کوئی دوسری زبان ترقی کرتے ہوئے اسے برسرِ اقتدار اور طبقہ اشرافیہ کی گفتگو اور مطالعے سے بھی نکال باہر کر دیتی ہے۔ برصغیر میں سنسکرت اور فارسی زبانیں اس کی روشن مثالیں ہیں۔ دنیا کی دیگر بہت سی زبانیں جو اپنے دور میں ترقی یافتہ تھیں اور اظہار و ابلاغ کا ذریعہ تھیں، نہ صرف اپنا وجود کھو بیٹھیں بلکہ ان کے شاہکار ادب کے لیے کوئی قاری ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتا۔

علم اللسان کے مطالعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مختلف ادوار میں دُنیا کے مختلف خطّوں اور قوموں کی زبانیں ایک دوسرے کے قریب آکر باہمی روابط کو پروان چڑھاتی رہیں۔ کبھی یہ عمل عسکری تصادم کے نتیجے میں سامنے آیا تو کبھی تجارت اور معاشی کارگُزاریوں کی صورت میں، کبھی اس کے پس پردہ ارضی و سماوی آفات تھیں تو کبھی مذہبی اور نظریاتی تحریکیں۔۔۔ عسکری تصادم کی صورت میں غالب یا فاتح گروہ بالعموم مغلوب و مفتوح اقوام پر اپنی زبان اور تہذیب کو مسلط کرتا ہے جس سے برسرِ اقتدار طبقے کی زبان ہی عموماً سرکاری، دفتری، تعلیمی اور عدالتی زبان قرار پاتی ہے۔ ایسی صورت حال میں مغلوب اقوام کو اپنی زبانوں کی بقا کا سوال درپیش ہوتا ہے۔ چنانچہ جو زبانیں خود کو زندہ رکھنے اور عصری تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے برسرِ اقتدار طبقے کی زبان اور دوسری ترقی یافتہ زبانوں سے کنارہ کش ہونے کی بجائے اُن سے فیض یاب ہو کر خود کو زندہ رکھنے کی کوشش کرتی ہیں۔، وہ نہ صرف اپنی بقا کو یقینی بنا لیتی ہیں بلکہ اپنے عہد کی ترقی یافتہ زبانوں کی صف میں شامل ہو جاتی ہیں۔ بعض اوقات زبانوں کو کئی دوسرے مسائل سے بھی نبرد آزما ہونا پڑتا ہے۔ مثلاً اگر کوئی زبان ایک وسیع خطے میں پھیلی ہوئی مختلف تہذیبی، جغرافیائی اور لسانی خصوصیات کی حامل آبادیوں میں رائج ہو تو آہستہ آہستہ اس پر مقامی اثرات غلبہ حاصل کرنے لگتے ہیں، جس سے ایک ہی زبان کی مختلف بولیاں اور لہجے وجود میں آجاتے ہیں۔ بعض اوقات ان بولیوں اور لہجوں کے اختلافات کم ہوتے ہیں جب کہ بعض صورتوں میں یہ اختلافات اس قدر بڑھ جاتے ہیں کہ یہ لہجے اور خام بولیاں بتدریج نئی زبانوں کی شکل اختیار کر لیتی ہیں شمالی برصغیر کی بیشتر پراکرتیں اسی طرح وجود میں آئیں۔ بظاہر یہ الگ الگ زبانیں ہیں لیکن اشتراک کے ایک ایسے بندھن میں جکڑی ہوئی ہیں کہ ایک زبان کو بولنے والا تھوڑی سی جستجو کے بعد اس خاندان

کی دیگر زبانوں میں بھی استعداد حاصل کر لیتا ہے۔ برصغیر میں دکن اور شمالی ہندوستان کی زبانوں میں پائے جانے والے بُعد کو اسی تناظر میں دیکھنا چاہیے۔ شمالی برصغیر کی بیشتر زبانوں کا تعلق ہند آریائی خاندان سے ہے، جب کہ دکن کی زبانیں دراوڑی اور زبانوں کے بعض دوسرے خاندانوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ اُردو کا تعلق چونکہ ہند آریائی زبانوں سے ہے۔ اس لیے شمال کی زبانوں کے اثرات اُردو اور اُردو کے اثرات شمالی ہندوستان کی مقامی زبانوں پر خوش گوار نتائج کے حامل ثابت ہوئے اور اختلافات بھی زیادہ نظر نہیں آتے لیکن اُردو اور جنوب کی زبانیں صدیوں تک ساتھ ساتھ چلتے رہنے کے باوجود ایک دوسرے پر خوش گوار اثرات مرتب نہ کر سکیں کیونکہ فریق زبانیں دو مختلف خاندانوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر راؤف پاریکھ نے بڑی دلچسپ بات کی ہے۔

> ''یسور کے مسلمان جب آپس میں روانی سے اُردو میں بات کرتے ہیں تو شمالی ہند کے اُردو جاننے والوں کے پلے کچھ نہیں پڑتا اور اُنھیں ایسے لگتا ہے کہ وہ اُردو میں نہیں بلکہ اپنی مقامی زبان کنڑ میں بات کر رہے ہیں۔ میسور والوں کی اُردو جو شمالی ہند والوں کی اُردو سے خاصی مختلف معلوم ہوتی ہے، دراصل اُردو کا ایک ڈیلیکٹ، علاقائی رُوپ یا اُردو کی علاقائی تحتی بولی ہے۔ جس کے بولنے والوں کو آپس میں تو کسی لسانی اختلاف کا احساس نہیں ہوتا لیکن یہ دوسرے علاقوں کے اُردو بولنے والوں کے لیے ایک الگ طرح کی اُردو یا اُردو کی علاقائی بولی ہے۔''(۳)

محققین لسانیات کے بقول دُنیا کے مختلف خطّوں میں بڑے بڑے لسانی انحرافات ہوئے، مختلف خصوصیات رکھنے والی بولیاں اپنے اپنے گروہی اختلافات کم کر کے ایک دوسرے کے قریب آئیں۔ کبھی بولیاں زبانوں میں اور کبھی زبانیں بولیوں میں تبدیل ہوئیں۔ زبانوں اور بولیوں کے اس طرح کے مدوجزر کی مثالیں ہر بڑے لسانی گروہ میں دکھائی دیتی ہیں۔ جغرافیائی لحاظ سے بولیوں کے سنگم پر بسنے والوں میں سے بہت سے لوگ اپنی بولی کے علاوہ دوسری بولیوں سے بھی استفادہ کرتے ہیں۔ چنانچہ ماہرین زبان کے اس قول میں کسی حد تک صداقت ہے کہ بولیوں کی حدوں کا تعین نہیں کیا جا سکتا۔ مغربی یورپ کی بولیوں کی توضیح و تشریح اور حد بندی پر خاصا تحقیقی کام ہوا ہے۔ لیکن ایشیاء اور افریقہ کی زبانوں اور حدوں کے بارے میں اس قسم کا کام تشنۂ تکمیل ہے۔ برصغیر پاک و ہند کی زبانوں،

ان کی خصوصیات اور باہمی اشتراک کے پہلوؤں پر جارج گریرسن نے ایک صدی قبل اپنی کتاب، ''لینگو اسٹک سروے آف انڈیا'' میں قابل قدر کام کیا تھا جسے آگے بڑھانے کی ضرورت ہے۔

زبان کے عملِ انحراف میں یہ بات مشاہدے میں آئی ہے کہ زبان میں افقی سطح کے یا علاقائی سطح کے انحرافات کے علاوہ عمودی سطح کے یا سماجی اور طبقاتی سطح کے انحرفات بھی ہوتے رہتے ہیں۔ بولیوں کے باہمی فرق اور امتیاز کا تو پتہ لگایا جا سکتا ہے لیکن ہماری اپنی بولی یا زبان میں جو تغیرات ہوتے رہتے ہیں۔ انھیں ہم محسوس نہیں کر سکتے کیونکہ بالعموم وہ ہماری نظروں سے اوجھل رہتے ہیں۔

زبانوں میں لفظی، صوتی اور معنوی تغیرات وانحرافات فطری وارتقائی سطح پر ہوں یا ماہرین لسانیات کی شعوری کاوشوں سے، ایک بات طے ہے کہ اس عمل کی ٹھوس وجوہ ہر دور میں موجود رہی ہیں جن میں سے زیادہ اہم درج ذیل ہیں:

- زبانوں کے جدید اور قدیم مفہوم میں تبدیلی کو سمجھنے کے لیے اس بات کو پیش نظر رکھنا ہوگا کہ لفظ کا زبان اور معانی و مفاہیم سے کیا تعلق ہے۔ اس کے لیے لفظ کے صوری و صوتی نظام، نشانات، صرف و نحو، لب ولہجہ، طرزِ اظہار اور اسلوب و طریق کے نظام کا جائزہ لینا ضروری ہے نئے ماحول اور بدلتے ہوئے حالات میں لفظیات کے مفاہیم کیسے بدلتے ہیں۔ اس کا فیصلہ عام لوگ نہیں کر سکتے، صرف ماہرینِ زبان ولسانیات ہی اس مسلے کو بہتر طور پر حل کر سکتے ہیں۔
- زبانوں کی عالمی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بہت سے الفاظ کھوٹے سکے بن کر زبانوں کے ٹکسال سے باہر ہوتے رہتے ہیں اور ان کی جگہ خاص و عام میں زیادہ سے زیادہ قابل قبول الفاظ لیتے رہتے ہیں۔ انگریزی میں اس طرح کی تبدیلیوں کی بہتات ہے، یہاں تک کہ آج کے انگریزی دان کے لیے الفریڈ کے عہد کی زبان بالکل اجنبی اور ناقابل فہم ہے، اس طرح قدیم فارسی جدید فارسی سے بہت مختلف ہے، یہی حال جرمن، فرانسیسی، اطالوی، پُرتگیزی، یونانی، عربی اور دُنیا کی دیگر زبانوں کا ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر شوکت سبز داری اپنی کتاب ''لسانی مسائل'' میں لکھتے ہیں۔

> ''جب تک زبان بول چال میں کام آتی ہے، قوت ونمو سے مالا مال ہے اس کے الفاظ بولنے والوں کی زبان پر کٹتے، جھٹتے اور ترستے رہتے ہیں اس تراش خراش اور کانٹ چھانٹ کے دوران میں بہت سے الفاظ مٹ جاتے اس۔۔۔ دنیا کی شائد ہی کوئی زندہ اور نامی زبان ہو

جس میں اس نوح کی تبدیلیاں نہ ہوئی ہوں۔۔۔ الفلاس، چارلے میگنے اور گوئیٹے کہنے کو تینوں جرمن ہیں لیکن ان کی زبانوں میں کتنا تفاوت ہے، اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ بائبل کا موجودہ انگریزی ترجمہ ۱۶۱۱ء کے لگ بھگ ہوا تھا، پادری جے بوکرنے ۱۸۶۲ء میں ایک فرہنگ شائع کی جس میں اُن متروک الفاظ کی شرح کی گئی جو بائیبل میں استعمال ہوئے تھے۔ پروفیسر میکس مولر کا بیان ہے کہ یہ کُل استعمال شدہ الفاظ کا پانچواں حصہ ہے۔ ڈھائی سو سال کے اندر ایک ضخیم کتاب میں الفاظ کا پانچواں حصہ استعمال سے خارج ہو گیا۔ اس سے زبان کے حک و اصلاح اور لفظوں کی قطع برید کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔"(۴)

حقیقت یہ ہے کہ جو غریب اور غیر موزوں الفاظ کسی زبان سے متروک قرار پاتے ہیں وہ نہ صرف یہ کہ اپنی ساخت، بناوٹ اور ادائیگی میں رائج زبان میں اجنبی دکھائی دیتے ہیں بلکہ انھیں اشرافیہ اور اہلِ زبان پہلے ہی اپنی روزمرہ بول چال سے خارج کر چکے ہوتے ہیں۔

- وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ زبان کے مختلف حروف اور الفاظ کی ساخت اور بناوٹ بدلتی رہتی ہے۔ جیسے اُردو کا موجودہ حرف "سے" ہے مختلف ادوار میں یہ "سون" (برج زبان کی مناسبت سے) سی یا سین (قدیم مرہٹی کی مناسبت سے) سوں (قدیم ہندی کی مناسبت سے) سیں، شوں یا شیں (گجراتی کی مناسبت سے) استعمال ہوتا رہا ہے۔ جسے آخرکار "سے" میں تبدیل کر لیا گیا۔
- اُردو کے ارتقائی مراحل میں تصرفات کے باقاعدہ اور بے قاعدہ استعمال کا سلسلہ جاری رہا ہے۔ خصوصاً دکنی دور کی اُردو میں مقررہ قواعد و ضوابط پر عمل در آمد کم ہوتا تھا۔ شعر و ادب کے ساتھ ساتھ وہاں عام بول چال میں بھی خلافِ قواعد رجحان دکھائی دیتا ہے۔ شعرا اور نثار فارسی عروض کی سخت پابندیوں سے مجبور ہو کر زبان میں بہت کچھ تصرف کر لیتے تھے۔ علم عروض کی کتابوں میں ان لسانی تصرفات کی بہت سی مثالیں دکھائی دیتی ہیں یہ تصرفات زبان کے قواعد، گرامر اور عروض کو نظر انداز کرنے کا نتیجہ تھے، جیسے متحرک کو ساکن یا ساکن کو متحرک بنا لینا، کسی ایک حرف کو گرا دینا یا لفظوں کی نحوی ترتیب کو بدل دینا، مذکر کو مونث یا مونث کو مذکر بنا لینا، فاعل جمع کے لیے فعل مفرد لانا، کسی عربی یا فارسی لفظ کی ہندی لفظ کی طرح اضافت وغیرہ کا

عمل ایسے تصرفات کی مثالیں ہیں۔ اُردو میں اصلاح زبان کی تحریک کے پس منظر میں یہ تصرفات اور لسانی بے قاعدگیاں بھی شامل تھیں۔

- زبانوں میں رسم الخط اور املا میں بھی مختلف ادوار میں تغیرات کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ حروف تہجی اور اعراب کسی زبان کی عبارت کی بنیاد ہیں اسی پر زبان کا تحریری املا اور تلفظ استوار ہوتا ہے۔ اس لیے وقت کے نئے تقاضوں کے تحت اس میں تغیر وترمیم کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔

زبانیں مختلف تاریخی، سیاسی، معاشی اور تہذیبی وجوہ کی بنا پر دوسری زبانوں کے الفاظ اپنے اندر داخل کرتی رہتی ہیں۔ علم اللسان میں انھیں دخیل الفاظ کہا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں یہ بات پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ ایک زبان دوسری زبان کے الفاظ کو اپنے صوتی نظام ہی کے تحت قبول کرتی ہے۔ اگر کوئی لفظ اپنی اصل زبان کے تلفظ کے مطابق دوسری زبان میں لکھا اور بولا جائے گا تو وہ غیر فطری اور غیر موزوں دکھائی دے گا (واضح رہے کہ اُردو کے لیے عربی، فارسی اور ہندی زبانوں کو دوسری زبانوں کا درجہ حاصل نہیں کیونکہ انھیں زبانوں نے اس کی تشکیل کی ہے۔)

اُردو زبان کی تاریخ زیادہ دور تک نہیں جاتی اُردو، اُردوئے معلیٰ، ریختہ، ہندی ہندوی اور ہندوستانی کے ادوار کو ملا کر کوئی سات سو سال کی تاریخ میں گزشتہ دو صدیوں میں جو صوتی، حرفی اور معنوی تغیرات ہوئے، اُنھوں نے اس کا نقشہ بڑی حد تک تبدیل کر دیا، خصوصاً اٹھارہویں صدی میں یہ عمل زیادہ تیز رفتاری سے آگے بڑھا ہے۔

اُردو میں تغیرات و انحرافات کو سمجھنے کے لیے سب سے پہلے دکنی دور کو دیکھنا ہوگا۔ چونکہ اُردو کے اولین ادبی دور میں جب یہ زبان سر زمین دکن میں پھل پھول رہی تھی اُس دور میں پورا شمالی برصغیر فارسی کے سحر میں جکڑا ہوا تھا۔ جنوبی ہندوستان میں دکنی اُردو دور کم و بیش چار سو سالہ تاریخ رکھتا ہے۔ لیکن اس طویل دور میں زبان کا اُلجھاؤ ختم ہوا نہ اس مشترکہ زبان میں تغیرات و اصلاحات کا کوئی مثبت عمل شروع ہو سکا۔ اس سلسلے میں پہلی انقلابی تبدیلی ولی دکنی کے ہاں نظر آتی ہے۔ جنہوں نے دکنی اُردو کے لہجے کو صاف کرنے اور شمالی و جنوبی اُردو میں اتحاد و ہم آہنگی کی شعوری کوششیں کیں، خصوصاً اُن کے دوسرے دور کے کلام میں فارسی روایات و لفظیات سے استفادہ، زبان کی صفائی، عروض و تلفظ کی طرف توجہ اور ہندی اردو دکنی بولیوں کے موزوں الفاظ کے چناؤ نے وہ خصوصیات پیدا کر دیں، کہ انھیں شمال اور جنوب میں یکساں پزیرائی حاصل ہوئی لیکن ولّی کی لسانی اصلاح کا دائرہ محدود

ہے۔ وہ اس میں وسعت لا سکے نہ زبان میں تصرفات کا ازالہ کر سکے۔ اُردو میں لسانی تحقیق اور لفظی تغیّرات کے حوالے سے اولین محققین میں سراج الدین آرزو کی خدمات قابل ذکر ہیں اُنھوں نے اُردو زبان کی لسانی تحقیق کی بنیاد رکھی اور فارسی سے اُردو الفاظ کا ہیتی و معنوی مقابلہ کر کے تقابلی مطالعے کی بنیاد ڈالی۔ اس سلسلے میں اُنھوں نے فارسی، سنسکرت اور اُردو کے توافق کے اصول بھی متعیّن کیئے اُنھوں نے اپنی تصنیف ''نوادالالفاظ'' میں بعض لفظوں کے معانی از سرِ نو متعین کیے اور لُغت میں ایسے الفاظ شامل کئے جو سنسکرت، فارسی اور ترکی کے الفاظ ہوتے ہوئے بھی اُردو زبان کا حصہ بن چکے تھے۔ اُنھوں نے اِن لفظوں کے مفاہیم میں پائی جانے والی اُلجھنوں کو دورُ کیا۔ آرزو بنیادی طور پر دہلوی لہجے کو اُردو زبان کی بنیاد تصور کرتے تھے، چنانچہ جو الفاظ دہلی کے عوام و خواص میں جس صورت میں رائج تھے وہ اسی صورت کو معیار بناتے ہیں۔

اُردو میں لسانی تغیرات، انحرافات اور متروکات کا سلسلہ اٹھاوھویں صدی کے شروع میں جس تیز رفتاری کے ساتھ ہوا اس کی نظیر اس سے پہلے کہیں دکھائی دیتی ہے نہ اس کے بعد اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے۔ کہ ظہور الدین حاتم نے اپنا جو دیوان ۱۱۲۲ھ میں مرتب کیا اس کی زبان صرف ۲۶ سال بعد اس قدر تبدیل ہو گئی کہ اُنھیں ۱۱۴۸ھ میں اپنے پورے دیوان کو از سرِ نو تبدیل کر کے اس کا نام ''دیوان زادہ'' (دیوان سے نکلا ہوا) رکھنا پڑا۔ اتنے قلیل عرصے میں زبان میں تغیّرات کا یہ عالم کہ اسے قابل فہم و سماعت بنانے کے لیے شاعر اپنی زندگی کے ایک مختصر دورانیے میں اپنا پورا دیوان تبدیل کر دے، کوئی اور زبان اس کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے۔ حاتم نے ''دیوان زادہ'' کے دیباچے میں اُن الفاظ کی ایک طویل فہرست دی ہے۔ جو انتہائی قلیل عرصے میں زبان سے خارج ہو گئے تھے۔ ڈاکٹر عبدالحق ''دیوان زادہ'' کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''قدیم و جدید کے امتیازات اور ان میں تبدیلی و انحراف کا سب سے فکر انگیز مطالعہ ہمیں حاتم میں ملتا ہے۔ حاتم نے ''دیوان زادہ'' کی ترتیب نو کے وقت اسی ضرورت کے پیش نظر پورے کلام کا ایک انتخاب کیا اور اس میں اضافہ و اصلاح کرتے ہوئے اُنھوں نے میں نیا انتخاب اور نئی ترتیب پیش کی اور بہت سے نئے اضافے بھی کیے۔۔۔ الفاظ و معانی کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ ایہام گوئی سے دست برداری، غزلوں میں بحروں کی تخصیص،

سنہِ تخلیق اور طرحی زمینوں کا اندراج بھی شامل کیا۔ اس طرح کلامِ حاتم کا انتخابِ نو نئی صورت اور نئے رجحان کے ساتھ پایہ تکمیل کو پہنچا۔"(۵)

حاتم کے "دیوان" اور "دیوان زادہ" کی زبانوں کا موازنہ اس دور کی اُردو کی تیز رفتار تبدیلی کو واضح کر دیتا ہے۔

اُردو زبان میں تغیرات وانحرافات کا ایک دور لکھنو میں اصلاح زبان کی تحریک کی صورت میں سامنے آیا۔ اس کی ابتدائی کاوشیں تو انشاللہ خان انشا اور مرزا قتیل کی کتاب "دریائے لطافت" میں ملتی ہیں لیکن اہل لکھنو کی متعدد علمی و ادبی شخصیات ان تغیرات وانحرافات کے سرے امام بخش ناسخ سے جا ملاتے ہیں۔ ناسخ اُردو کے لکھنوی انداز کو ممتاز و منفرد بنانا چاہتے تھے۔ وہ اس بات کا خاص اہتمام والتزام کرتے تھے کہ کوئی قدیم، متروک، غیر فصیح، نامانوس اور غریب لفظ یا محاورہ ان کے کلام میں استعمال نہ ہو۔ اُنھوں نے زبان اور شاعری کے لیے جو اصول واضح کیے اُن کی بنیاد بعض اصولوں پر تھی اس لیے انھیں ناسخ کے شاگردوں کے علاوہ اس دور کے دوسرے شعراء ادبا، ماہرین زبان اور اہل علم نے بالعموم قبول کیا اور ان پر بڑی حد تک عمل ہوا۔ ناسخ کے شاگردوں میر علی اوسط رشک، کلب علی نادر، جلال لکھنوی نے اصلاح زبان کو بعد ازاں ایک تحریک کی شکل دے دی۔ اس مقصد کے لیے اصول وضع ہوئے تصرفات کیے گئے اور ان پر سختی سے عمل ہوا۔ اس تحریک کے تحت اُردو میں صفائی ستھرائی ہوئی اور یہ زبان ایک نئے دور میں داخل ہوئی۔ اس سلسلے میں صغیر بلگرامی اپنے تذکرے "جلوہ خضر" میں لکھتے ہیں:

> "ناسخ سے پہلے بھی زبان میں تصرف کیا گیا لیکن ناسخ نے لکھنو میں جو تصرفات زبان کیے، اس نے زبان کی صورت ہی بدل دی اور ترکیب و بندش ہی اور کر دی اور ان کے تصرفات ایسے مقبول ہوئے کہ آج تک جاری ہیں اور ہمیشہ جاری رہیں گے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ناسخ کے تصرفات اصول سے ہوئے اور اگلوں کے تصرفات میں اصول کا پتہ نہیں۔"(۶)

زبان میں تغیرات ومتروکات کی لکھنوی تحریک نے جہاں اُردو پر مثبت اثرات مرتب کیے وہاں اس کے کئی پہلو کھٹکتے بھی ہیں۔ خودرو پودوں کی طرح اُگنے اور پروان چڑھنے والی اُردو اس دور میں دانستہ پابندیوں کی زد میں دکھائی دیتی ہے، خصوصاً ہندی لفظوں کا ترک اور ان کے غیر مانوس اور غیر

مستعمل مترادفات، اعلانِ نون کی پابندیاں، اضافت کے اصول اور فصحا کی زبان کی پیروی جیسے امور زبان کے اس فطری بہاؤ سے مطابقت نہیں رکھتے جو قبل ازیں اس کا خاصہ تھے۔ بیشتر محققین کا خیال ہے۔ کہ زبان کے سلسلے میں دبستان ناسخ کی ساری پابندیاں رشک بحر اور نادرِ کے ایما پر لگائی گئیں جب کہ تصویر کا دوسرا رُخ یہ ہے کہ اس تحریک کے زیر اثر، محاورہ روز مرہ، تذکیر و تانیث، قواعدِ زبان اور تلفظ و املا کے حوالے سے متعدد مفید اصلاحات بھی سامنے آئیں جن سے آج بھی اُردو دان مستفید ہو رہے ہیں۔

لسانی تغیرات کے حوالے سے انفرادی کاوشوں اور اہل لکھنو کے شعوری اقدامات کے علاوہ بعض اداروں کی خدمات بھی قابل ذکر ہیں۔ ان میں سے فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے تحت اُردو زبان خصوصاً اُردو نثر کے حوالے سے بعض ترامیم و تغیرات نے روایتی اسالیب کے ساتھ ساتھ کچھ نئے رجحانات کو بھی متعارف کرایا، چنانچہ کالج میں دارالترجمہ کے ساتھ جب اُردو ٹائپ کا مطبع قائم کیا گیا تو اس سے اُردو رسم الخط کی کسی حد تک نئی صورت مطبوعہ کُتب میں نظر آئی۔ اگرچہ یہ صورت خطِ نسخ کی تھی لیکن یہ نستعلیق سے مشابہ تھی۔ اس سے تحریر وانشا میں یکسانیت پیدا ہوئی مختلف لفظوں کو یک جا کر کے لکھنے کے رجحان میں کمی واقع ہوئی اور کئی ابہام دور ہوئے دوسری زبانوں سے تراجم سے کئی نئے الفاظ، تراکیب اور اصطلاحات اُردو زبان کا حصہ بنیں اور قواعد زبان میں مشرقی زبانوں کے ساتھ ساتھ مغربی زبانوں کے انداز کو بھی رواج ملا بعض متبادل الفاظ کے نہ ملنے سے کئی انگریزی اور دوسری یورپی زبانوں کے الفاظ اُردو کا حصہ بنے، جس سے زبان میں وسعت پیدا ہوئی اور تحریروں میں تازگی کا احساس اُجاگر ہوا۔ اس ضمن میں گل کرسٹ کے جو اقدامات سامنے آئے اُن میں نستعلیق ٹائپ کی تیاری، یائے معروف، یائے مجہول، واؤ معروف اور واؤ مجہول وغیرہ کے فرق کو طباعت میں واضح کرنا شامل تھے۔

انجمن ترقی اُردو کے ادارے نے بھی اُردو زبان میں ترامیم واصلاحات کی طرف توجہ دی۔ ان میں لفظوں کو ملا کر لکھنے کی بجائے الگ الگ تحریر کرنا، فارسی الفاظ بہ، نہ چہ، کہ، نے، وغیرہ کا عبارت یا جملے میں الگ تحریر کرنا، عربی لفظوں کی نئی تحریری تشکیل، عربی حروف شمسی و قمری کے اُردو میں فرق کا خاتمہ، اعراب، رموزِ او قاف اور رسمِ خط کو زیادہ آسان بنانے کے لیے بعض تجاویز شامل ہیں۔ لسانی ترامیم واصطلاحات کی شعوری کوششوں کے حوالے سے جامعہ عثمانیہ اور ادارہ تصنیف و تالیف حیدرآباد دکن، سر رشتہ تعلیم متحدہ پنجاب، ترقی اُردو بورڈ بھارت، اُردو ڈکشنری بورڈ پاکستان، اُردو دائرہ معارف

اسلامیہ، مقتدرہ قومی زبان کے نام بھی قابل ذکر ہیں۔ ان میں مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد نے اُردو حروف تہجی میں ترامیم و تغیّرات، دفتری املاِ مختصر نویسی، رموز نویسی دفتری اصطلاحات و ترکیبات کے علاوہ اصطلاحیات کے عنوان سے نئی اصطلاحات کے پروگرام عصری تقاضوں کے حوالے سے مثبت اقدامات ہیں۔

زبانوں کے سلسلے میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ان کا رسم خط ہمیشہ ایک جیسا نہیں رہتا ان کا نظام مختلف ادوار میں تغیر و ترامیم کے مراحل سے گزرتا رہا ہے۔ اُردو حروفِ تہجی اور رسمِ خط میں اس طرح کی ترامیم و اصلاحات کا سلسلہ وقتاً فوقتاً جاری رہا ہے یہ اپنے ارتقائی دور میں دیوناگری رسم خط میں لکھی جاتی تھی۔ فارسی بولنے اور لکھنے والے اسے فارسی رسمِ خط میں تحریر کرتے تھے۔ انگریزوں نے برصغیر میں قدم جمانے کے بعد کچھ عرصہ اس کے لیے رومن رسم خط اختیار کیا پھر دیوناگری اور فارسی رسمِ خط کو قومیتوں سے منسوب کیا غرض جس طرح اُردو زبان مختلف مراحل سے گزری اسی طرح اس کے رسمِ خط نے بھی مختلف مراحل طے کیے۔ رسم خط اپنی زبان کی اصوات سے ہم آہنگ ہوتا ہے۔ اسے ان صوتی تقاضوں سے کماحقہ نبرد آزما ہونے کے لیے ایک خاص عرصہ درکار ہوتا ہے۔ آج اُردو دان رسمِ خط کے سلسلے میں خطِ نستعلیق پر متفق ہیں لیکن خود یہ رسم خط بھی بڑی تبدیلیوں سے گزرا ہے۔ آج کا اُردو دان سودا کے دور کا خطِ نستعلیق پڑھتا ہے۔ تو اسے قدم قدم پر مشکلات پیش آتی ہیں خصوصاً نکتوں کے نظام میں خاصے اُلجھاؤ رہے ہیں اس طرح حائے حطی، ہائے ہوز، ہائے مخلوط کے علاوہ یائے معروف، یائے مجہول اور یائے لین کے سلسلے میں مختلف ادوار میں مختلف صورتیں پیش آتی رہی ہیں ہو سکتا ہے کہ آنے والے دور میں کمپیوٹر کی ضرورت اور تقاضوں کے تحت اُردو کا رسم خط ابھی مزید ترامیم کے مرحلے سے گزرے۔

لسانی تغیرات کے حوالے سے اس امر کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ خواہ یہ فطری ارتقا کی صورت میں ہوں یا شعوری کاوشوں سے، اس کے لیے اہلِ زبان اور مرکزِ زبان کا ہونا ضروری ہے زبان کے بارے میں ایک کہاوت ہے کہ یہ ہر بارہ کوس کے بعد بدل جاتی ہے۔ اس طرح ہر شہر کی زبان اپنے مخصوص لفظوں، روز مروں، محاوروں اور ان کے طریقہ استعمال میں دوسرے شہر کی زبان سے قدرے الگ انداز اختیار کر لیتی ہے۔ اس سے ایک قواعد نویس یا محقق اُلجھن میں پڑ جاتا ہے کیونکہ اگر ہر جگہ کے الفاظ و محاورت کے استعمال کو روا رکھا جائے تو زبان میں اختلافات بڑھ جائیں گے، لہٰذا اس کے لیے

کوئی نہ کوئی معیار مقرر کرنا ضروری ہے، زبان کے بارے میں یہ معیار اس کے مرکز زبان کو حاصل ہوتا ہے۔ یاد رہے کہ جو شہر زبان کا مرکز قرار پاتا ہے، اُس کے تمام باشندے بھی اہل زبان نہیں ہوتے۔ عموماً شہر کے شرفا، فصحا، شعرا، اہل علم اور ان کی اولادوں کی زبان کو معیار کا درجہ حاصل ہوتا ہے۔ پھر ان کی زبان آہستہ آہستہ شہر کے عام لوگوں کی زبان بن جاتی ہے اور اس کے محاورہ رُوزمرہ کو سند کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے۔ زبان اور اس کے لفظیات آسمانی صحیفہ نہیں کہ ان کو من و عن تسلیم کرانے پر اصرار کیا جائے۔ تصیح زبان و تلفظ کے لیے ضروری ہے کہ ایک خاص آبادی کی زبان اور اس کے اندازِ بیان کو معیار مان لیا جائے اور جو لفظ محاورہ، روزمرہ اور کہاوت اس کے مطابق ہو اسے صحیح تسلیم کر لیا جائے، دنیا کی معروف زبانوں میں یہی اصول رہا ہے عربی میں قریش کی زبان کو معیاری تصور کیا جاتا تھا۔ انگریزی میں لندن کی زبان اور جرمنی میں برلن اور بون کی زبانوں کو معیار کا درجہ حاصل ہے۔

اُردو کے مرکز زبان کے بارے میں یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ ماضی میں دہلی کو یہ حیثیت حاصل تھی۔ بعد ازاں لکھنو کی بھی یہ مقام ملا۔ اس دور میں پورا برصغیر محاورہ، روزمرہ اور قواعد و تلفظ کی سند وہاں سے حاصل کرتا تھا۔ انیسویں صدی کے اختتام تک دہلی اور لکھنو میں فصحا کی تعداد کا یہ عالم تھا کہ اُردو زبان پر مہارت کا بڑے سے بڑا دعویدار بھی بات سوچ سمجھ کر کرتا تھا کہ قواعد کی کسی غلطی پر قدم قدم پر روک ٹوک کرنے والے موجود تھے مسلمان تو مسلمان ہندو، سکھ، انگریز اور پارسی بھی درست اُردو بولنے کے خواہاں تھے اور اسے اپنے لیے فخر کی بات سمجھتے تھے۔ زمانے نے کروٹ بدلی اور اہل زبان اپنے مراکز سے منتشر ہو گئے اور وہاں کی فضاؤں میں اجنبی آوازوں کے اژدحام میں نستعلیق اُردو کی آواز دب کر رہ گئی۔

اُردو کا تحریک پاکستان اور مملکتِ پاکستان سے جو تعلق ہے۔ وہ محتاج وضاحت نہیں۔ اسے پاکستان کی قومی زبان کا درجہ حاصل ہے۔ چاروں صوبوں، آزاد کشمیر اور شمالی علاقہ جات کے لیے رابطے کی زبان بھی یہی ہے اس کا شمار دُنیا کی اُن زبانوں میں ہوتا ہے جو بین الاقوامی حیثیت کی حامل ہیں، لہذا اس کے وسیع تر حلقہ اثر کو دیکھتے ہوئے اس کے مرکز کے لیے نئے معیارات کے تعین کی ضرورت ہے۔

حواشی حوالہ جات

۱۔ خلیل صدیقی، زبان کیا ہے، ملتان: بیکن بکس گلگشت کالونی ۲۰۰۹ء، ص ۵۷

۲۔ خلیل صدیقی، زبان کا اِرتقاء، کوئٹہ: زمُرد پبلی کیشن، ۲۰۰۰ء، ص ۲۲۲۔۲۲۳

۳۔ ڈاکٹر راؤف پاریکھ، مضمون ''پاکستان زبانیں، تحتی بولیاں اور قومی یکجہتی'' مجلہ ''تحقیق'' شمارہ ۱۶۔ شعبہ اُردو، جام شورو، سندھ یونیورسٹی ۲۰۰۸ء ص ۵۰۔

۴۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری، لسانی مسائل، کراچی: مکتبہ، اسلوب، مسلم لیگ کواٹر، ناظم آباد ۱۴۶۲ھ ص ۲۶۳۔

۵۔ ظہور الدین حاتم، انتخابِ حاتم، ''دیوان زادہ'' مرتب ڈاکٹر عبدالحق، دہلی جمال پرنٹنگ پریس ۱۹۷۷ء۔ ص ۲۹۔۳۰

۶۔ فرزند احمد صغیر بلگرامی، جلوہ خضر، (جلد دوم) لکھنو، مطبع نوادرالانوار بارِ اوّل ۱۸۸۵ء۔ ص ۷۰

۷۔ خلیل صدیق، زبان کیا ہے، ملتان، بیکن، بکس، گلگشت کالونی ۲۰۰۹۔ ص ۵۶